© rasailojaraid.com

# حرفِ اوّل

## کہ راہوارِ یقینِ ما بصحرائے گماں گم شد

راقم الحروف نے پروفیسر مرزا محمد منوّر مرحوم ومغفور کے شعر کا ایک مصرعہ زیرنظر مختصر سی تحریر کا عنوان بوجوہ بنایا ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ جس طرح کم وبیش ربع صدی قبل پروفیسر صاحب نے ملّتِ اسلامیہ کے ایمانی کیفیت کی نقشہ کشی کی تھی‘ اس میں کسی طور کمی کی بجائے معاملہ افزوں تر ہے۔ عددی لحاظ سے اگرچہ صورت حال مختلف ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ دو دہائیوں کے دوران عالمی سطح پر جتنے غیر مسلم حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے ہیں وہ اَعدائے اسلام کے لیے ہوشربا ہے۔ اگر قبولِ اسلام کے اس رجحان کو اسلام کے پھیلاؤ کا انڈکس مان لیا جائے تو گمان غالب ہے کہ مستقبل قریب میں مسلمان تعداد کے اعتبار سے عیسائیوں سے بڑھ جائیں گے اور اسلام دنیا میں دوسرے نمبر کی بجائے پہلے نمبر پر آ جائے گا۔ انٹرنیٹ پر موجود عامر الہوشان کا مضمون تفصیلی اعداد وشمار کے ساتھ ثابت کرتا ہے کہ اسلام دنیا کا سب سے تیزی سے پھیلنے والا دین ہے۔ اس صورت حال کے برخلاف اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنے جذبات کے تحت مغربی اقوام کا انہیں بالعموم تشدد پسند‘ غیر مہذّب انبوہ قرار دینا ایک پوری تہذیب کی تذلیل ہے اور مغربی طاقتوں کے اخلاقی دیوالیہ پن کا بین ثبوت ہے‘ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ملّتِ اسلامیہ میں سابقہ USSR کے برخلاف مغرب کے لیے کوئی خفیہ عناد یا سیاسی سازش ومخاصمت کا عنصر نہیں ہے‘ بلکہ وہ تمام نوعِ انسانی کو اُمتِ دعوت کا حصہ جان کر ان کے ساتھ معاملہ نصح وخیر خواہی کی بنیاد پر کرنا چاہتی ہے۔ جو اختلاف ہے وہ یقیناً ہے لیکن وہ فکری اور تہذیبی ہے۔

دوسری جانب نہایت افسوس کے ساتھ ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا ہے کہ اسلامیت اور ایمانی وروحانی ترفع کے اعتبار سے ہماری عظیم اکثریت کا معاملہ دگرگوں ہے۔ ایمان کے جس منبع وسرچشمہ یعنی قرآن حکیم کو ہمارے لیے ایک پاکستانی نژاد امریکی مسلمان پروفیسر آف فلاسفی کے فکر انگیز الفاظ میں نہ صرف oral and aural presence بلکہ انفرادی واجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں کے لیے ہادی ورہنما ہونا چاہیے تھا وہ ہماری توجہات سے باہر ہے۔ اس پر غور وتفکر تو کجا‘ ہم اس کی تلاوت بھی کم کم ہی کرتے ہیں۔ بلادِ اسلامیہ کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ بالخصوص دو حوالوں سے عصری فلسفیانہ لٹریچر میں پائے جانے والے افکار سے متاثر ہو کر وحی پر مبنی دین کے مسلّمات کو ہی چیلنج کرنا شروع کر دیتا ہے۔ میں آئندہ سطور میں انہی کی مختصر وضاحت اپنے محدود مطالعے کی روشنی میں کروں گا۔

گزشتہ صدی کے نصفِ اول کو مغرب میں فکر وفلسفہ اور منہاجیات میں وہ جدیدیت جو نشأۃ ثانیہ اور تحریکِ تنویر سے شروع ہوئی تھی‘ کا آخری اور مکمل ترین مرحلہ قرار دیا جا سکتا ہے جس کے بعد ’’پس جدیدیت‘‘



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(post-modernity) کا اندازِ فکر لیے ہوئے دانشور اور تصانیف ہمارے مطالعے میں آتی ہیں۔ ماقبل پیراگراف میں جن دومؤثر حوالوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ انہی دوادوار سے منسلک ہیں اور اسلام کے فکری پیراڈائم سے نہ صرف تعارض رکھتی ہیں بلکہ ان کے مابین بُعدالمشرقین ہے' کیونکہ یہ دورِ حاضر کے مائنڈ سیٹ یا بالفاظِ دیگر جاہلیتِ جدیدہ کے بنیادی تصورات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اوّل الذکر دور کے نمائندہ مفکّر کے طور پر برٹرینڈ رسل کو لیا جا سکتا ہے جس کی طویل عمر کے دوران لیکچرز اور تصانیف کے اثرات دنیا بھر میں پھیلے ہیں۔ اس کے نظامِ فکر کے مختلف گوشے ہیں' لیکن اس نے بالخصوص تعلیم کے مقاصد' تنقیدی فکر کی اہمیت اور منہاجیات پر بھی جا بجا خیالات کا اظہار کیا ہے جن میں ایک اہم نکتہ "value of uncertainty" (یعنی تشکیک اور غیر یقینی ذہنی وعلمی کیفیت کی اہمیت اور قدر و قیمت) ہے جسے بعض اہلِ قلم نے رسل کی متعدد نگارشات سے منتخب کر کے "A Liberal Decalogue" (یعنی لبرل ازم کے احکامِ عشرہ باندازِ شریعت موسوی کے احکامِ عشرہ) کا عنوان دیا ہے۔ ان دس احکام میں سب سے پہلا اور اہم ترین یہ ہے:

*Do not feel absolutely certain of anything.*

قارئین بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کس طرح یہ اصول ایک طرف تاریخ انسانی میں وحی ربانی اور پیغمبروں کے اقوال وافعال پر مشتمل دینی روایت پر تیشہ بن کر گرتا ہے' تو دوسری جانب انسانوں میں حتمیت اور قطعیت والا یقین وایقان جو ایک ناگزیر فطری ضرورت ہے' کی نفی اس سے ہوتی ہے۔ یورپ اور امریکہ کی جامعات میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے مسلم نوجوانوں کی کثیر تعداد برٹرینڈ رسل اور اس سے ملتے جلتے خیالات پیش کرنے والے مفکر کارل پوپر سے متاثر ہو کر مذہبی اذعان وایقان کو شک اور حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ چنانچہ دانشِ غرب کے زائدہ افکار نے انسان کے اعتماد' خدا پر ایمان' زندگی بسر کرنے کے لیے کسی ضابطے' راستے اور عقیدے --- سب کو نہ صرف ٹھیس پہنچائی ہے' بلکہ انہیں کمزور اور نامعقول (irrational) اور لغو (absurd) قرار دے کر انسان کو تشکیک اور تذبذب میں مبتلا کیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح علامہ اقبال نے بہت پہلے اس صورتِ حال کو بھانپ کر اس کی صحیح نباضی کی تھی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

علم حاضر پیش آفل در سجود | شک بیفزود و یقین از دل ربود

(جدید علم' غروب ہونے والوں کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ یہ انسان کو شک وشبہ میں مبتلا کرتا اور یقین و اعتماد دلوں سے رخصت کرتا ہے)

اور اسی لیے آج کا انسان ''بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم'' کی کیفیت سے دوچار ہے۔

اب آیئے دوسرے فکری عامل کی طرف۔ مابعد جدیدیت کی عصری فکریات اور فلسفہ علومِ عمرانی میں کثیر المدنیت یا multiculturalism کو آج کل قبولِ عام حاصل ہے' جس کا جملہ اصولوں میں اہم ترین سلوگن ایک مشہور مصنف نے اس طرح پیش کیا ہے:

*Beware of dichotomies; Avoid pernicious dualisms; Think dialectically.*



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مغربی دانشوروں کی تحریروں کا سحر اور علمیات کے میدان میں اس اپروچ کا اثر بڑے پیمانے پر ہمارے ہاں کے روشن خیال قلم کاروں نے بھی قبول کیا ہے' چنانچہ اس قبیل کے خواتین و حضرات اپنے اس فکر کو بڑی شد و مد کے ساتھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ہمیں ہر معاملے میں binary اور exclusivist انداز کی بجائے سب سے کمپرومائز اور ایڈجسٹمنٹ (مصالحت و مفاہمت) کر کے چلنا چاہیے' جبکہ امر واقعہ ہے کہ ایک مسلمان جو قرآن و حدیث کے محکمات پر یقین رکھتا ہے' ہرگز اس پالیسی کو اختیار نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس کی پوزیشن اس شعر کے مطابق ہوتی ہے ؂

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے　　　شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول!

حقیقت یہ ہے کہ حق و باطل' خیر و شر اور عدل و ظلم کے مفاہیم اور تصورات (Categories, Notions) متضاد اور متخالف ہیں اور ان کو خلط ملط کرنے کی اجازت قانونِ خداوندی ہرگز نہیں دیتا۔ حق پرستوں اور کفر و عدوان کے پرستاروں کے درمیان polarization کو کبھی ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا اگر ممکن ہوتا تو رحمۃ للعالمین ﷺ کے عہدِ رسالت میں یقیناً ہو چکا ہوتا' جبکہ سیرت طیبہ کے تاریخی حقائق گواہ ہیں کہ دین اسلام اور کفر کے نظام کا فرق اور حق و باطل کی کشمکش آپ ؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات تک جاری رہی۔ شک و شبہ اور غیر قطعیت کو ایک اعلیٰ علمی قدر اور رویے کے طور پر اپنانے کا نتیجہ عملاً ''جاہلیتِ جدیدہ''، لبرل ہیومن ازم' حق سے روگردانی اور اھواء اور خواہشاتِ نفس کی پیروی کی صورت میں ہر ہوش مند اور دیدۂ بینا رکھنے والا شخص دیکھ سکتا ہے۔ یونیورسٹیوں میں پڑھائے جانے والے فلسفہ و دانش کا معاملہ بھی انتہائی مایوس کن ہے جسے مغرب کے بعض سنجیدہ مفکر خود بھی محسوس کرتے ہیں۔ واقعتاً نام نہاد مفکرین کی کیفیت قرآن کے الفاظ میں ﴿الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ خَوْضٍ یَّلْعَبُوْنَ﴾ — ''وہ حق کی تکذیب اور استہزاء اور بیہودہ گوئی میں اچھل کود کر رہے ہیں۔'' (ترجمہ' مولانا محمد جونا گڑھی) — کی تصویر ہے۔ اس کی تصویب خود ایک اہم برطانوی فلسفی ایلسڈیئر میکنٹائر نے ان الفاظ میں کی ہے کہ اب فلسفیوں کے پاس لسانی تحلیل و تجزیہ بعنوان 'Language games' اور 'Epitaph writing' (لوحِ مرقد پر لکھے جانے والے چند الفاظ اور مختصر عبارت) کی تحریر کا کام رہ گیا ہے۔ اس صورت حال میں مسلمانوں کو قرآن حکیم میں دیے گئے علم و حکمت اور ابدی اور غیر مبدّل ہدایت پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ چنانچہ علامہ اقبال کا یہ شعر ؂

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست
عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست

جہاں ایک طرف نویدِ جانفزا ہے' تو ساتھ ہی دعوتِ فکر اور دعوتِ عمل بھی ہے کہ قرآن کریم کی دی ہوئی روشنی اور نور سے ہم تشکیک اور ارتیابیت کے اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتی ہوئی انسانیت کو صراطِ مستقیم دکھائیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ علمائے اُمت' بالخصوص برادر بزرگ ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کی قائم کردہ انجمن خدام القرآن کے تمام وابستگان کو اس مبارک کام اور فریضے کو کماحقہ ادا کرنے کی توفیق ارزانی کریں۔ آمین!



© rasailojaraid.com